پروفیسر احتشام حسین

اقبال کی شاعری اور انقلاب روس

انقلاب روس کوئی وقتی یا عارضی سیاسی ہنگامہ نہیں تھا بلکہ ایک عالمگیر زندہ اور اور پُر حرکت فلسفہ کا عملی اظہار تھا جس نے بہت سی قوموں اور بہت سے مفکروں کی آنکھیں کھول دیں۔ اور انسان کو آزاد اور آسودہ زندگی کا ایک نیا شعور بخشا، آگہی اور ترقی کی ایک نئی راہ دکھائی۔ چونکہ اس کا مقصد ایک نیا تصور حیات پیش کرنا تھا۔ اس لیے مختلف تصور حیات رکھنے والوں نے اس کا خیر مقدم مختلف شکلوں میں کیا۔ آزادی چاہنے والوں نے اسے سراہا اور استعماریت پسندوں کو پیام مرگ ملا۔ گویا اثر پذیری کی نوعیتیں الگ الگ مدارج اور الگ الگ انداز رکھتی تھیں۔ کیونکہ مختلف ارباب فکر کے سماجی، طبقاتی اور علمی شعور کی منزلیں مختلف تھیں۔ ایسا انقلاب جو زندگی کے بنیادی ڈھانچے کے ساتھ ساتھ فکری اور ذہنی ڈھانچے کو بھی متاثر کرتا ہو۔ شعر و ادب کی دنیا میں ایک خاص نوعیت سے داخل ہوتا ہے۔ اس لیے اگر ہم علامہ اقبال کی شاعری اور افکار میں اس کے اثرات کو تلاش کریں گے۔ تو ہمیں ان ساری پیچیدگیوں کو ذہن میں رکھنا ہوگا جن سے اقبال کا شعور دوچار ہوا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی شاعری زندہ محرکات کی شاعری ہے حصول مقصد کی کشمکش، انسانی عظمت پر یقین اور قوت حیات کی جستجو نے انھیں سراپا فکر اور ہمہ تن جذبہ بنا دیا تھا۔ ایک اچھے صاحب فکر انسان کی طرح احساس اور علم کی تمام قوتوں سے کام لے کر اور زندگی کے مختلف گوشوں سے روشنی حاصل کرکے وہ اپنے نصب العین

کو تقویت پہنچاتے رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اظہارِ خیال نے ان کے لیے احساسِ فرض کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اور شعر گوئی کو انھوں نے انسان کے اندر سوئی ہوئی قوتوں کو جگانے اور ان کی زنگ آلود صلاحیتوں پر جِلا دینے کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ اس خیال کو اقبال نے بار بار اور فارسی شاعری میں خوب صورتی سے نمایاں کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں:

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

دوسری جگہ فارسی میں کہا ہے:

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

یہی خیال ایک جگہ یوں ظاہر ہوا ہے:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

یا اس طرح اپنے مقصد کی اہمیت پر زور دیا ہے:

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

وہی شاعر مقصد اور شاعری میں ہم آہنگی کی کوشش کر سکتا ہے جسے اپنے فن پر بھروسہ ہو اور اپنا مقصد عزیز ہو۔ جو شاعری کو "خونِ جگر" اور "سوزِ دروں" قرار دیتا ہو۔ اقبال ایسے ہی شاعر تھے۔ اس لیے جب ان کی شاعری اور عمر تفکر اور تجسس کا شباب تھا۔ انقلاب روس سے ان کا متاثر نہ ہونا حیرت خیز ہوتا۔

چند اور ضروری باتوں کا ذکر کر لیا جائے تو اس بات کے سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ کہ انقلاب روس اشتراکیت، مارکس اور لینن کی تعلیمات اور دوسرے عصری کی جانب اقبال کا ردِّ عمل وہی کیوں تھا جو ہمیں ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ تفصیلات میں گئے بغیر ہمیں اقبال کے ماحول، تعلیم، ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد، برطانوی حکومت کے متضاد اثرات، ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاست، اسلامی روایات میں شریعت اور طریقت، عقلیت اور قدامت پرستی کی کش مکش، سرسید کی تحریک، جمال الدین افغانی

کی ملت پرستی، مشرق وسطیٰ میں اسلامی اور یوروپی طاقتوں کی آنکھ مچولی۔ مغربی اور مشرقی افکار کے تصادم، ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ کے ارتقاء کی تاریخ، جدید سائنسی نظریات تاریخ اسلام، قرآن وحدیث اور خود ان کے شخصی اور انفرادی رجحانات کا ایک خاکہ پیش نگاہ رکھ کر ان کے کلام کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کرنا چاہیے کہ انقلاب روس کا مقام ان کے افکار میں کیا ہو سکتا تھا۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ وہ دنیا کے ان چند شعراء میں شمار کیے جائیں گے، جنھوں نے روس کے باہر اس انقلاب کی سیاسی اور معنوی اہمیت کو سمجھنے اور اسے اسی زمانے میں ادب میں پیش کرنے کی جرأت کی۔

اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اگرچہ ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد موجود تھی لیکن پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اس جدوجہد کی نوعیت انقلابی نہیں تھی۔ لڑائی میں برطانیہ کی فاتحانہ صورت حال اور بعد کی انقلاب دشمنی نے بالشویک انقلاب کو ایک "خبیث پیکر عفریت" بناکر پیش کیا تھا۔ ساری دنیا سے جو خبریں عام ہندوستانیوں تک پہنچتی تھیں، ان میں صداقت کا عنصر بہت کم ہوتا تھا اس لیے اس کے متعلق کسی قسم کے صحت مند ردِ عمل کی امید مشکل ہی سے کی جا سکتی تھی۔ پھر بھی جنگ کے ختم ہونے کے بعد اقبال کی شاعری میں اس عظیم الشان انقلاب کا جو پہلا تذکرہ ملتا ہے وہ حیرت خیز حد تک دلکش، پُرجوش اور ہمدردانہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہنی سفر میں ایک منزل آگئی اور گو بعد میں وہ اس منزل کو چھوڑ کر دوسری راہوں پر چلے گئے۔ لیکن یہاں سے انھوں نے جو توشہ لیا وہ کسی نہ کسی شکل میں برابر ان کے ساتھ رہا۔

۱۹۲۱ء میں اقبال نے اپنی مشہور نظم "خضرِ راہ" لکھی جو فکری اور فنی اعتبار سے ان کے شاعرانہ ارتقا میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں ان کے سامنے جنگ عظیم کے بعد کی بدلتی ہوئی دنیا اور اس کے مسائل ہیں۔ نئے اشتراکی جمہوری تصور کے مقابلے میں پہلی دفعہ انھیں نام نہاد مغربی جمہوریتیں "سرمایہ داروں کی جنگِ زرگری" نظر آئیں۔ پہلی دفعہ سرمایہ ومحنت کی کشمکش واضح شکل میں دکھائی دی۔ پہلی دفعہ انھیں سلطنت کا مفہوم سمجھنے کی خواہش

پیدا ہوئی۔ اور پہلی دفعہ انھوں نے تغیر پذیر حالات کی روشنی میں زندگی کا راز جاننے کی امنگ اپنے اندر پائی۔

خضرِ راہ کے دو ٹکڑے جو براہِ راست انقلاب روس اور اس کے پیغام سے متعلق ہیں۔ شاعرانہ قدرتِ بیان کا ساحرانہ مرقع ہیں:

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہوں غریبوں کو زکات

ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سُکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول!
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

نغمۂ بیداریِ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آور اسکندر و جم کب تلک

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

اس بات کے جاننے کے لیے کافی شواہد موجود نہیں ہیں کہ اقبال نے فلسفۂ اشتراکیت کا مطالعہ

کتنی گہری نظر سے کیا تھا۔ بلکہ ڈاکٹر دین محمد تاثیر اور انور بیگ نے متضاد رائیں دی ہیں۔ تاہم ایک بات یقینی ہے کہ اشتراکیت کے ان پہلوؤں نے جن کا تعلق سرمایہ داری کے استیصال، محنت کشوں کی دستگیری اور سلطانی جمہور سے ہے، اقبال کی رگوں میں خون کی گردش تیز کردی تھی اور جب کبھی ان کی نگاہ غریبوں کی زبوں حالی، سرمایہ داروں کی سنگ دلی، اور حاکم طبقہ کی آقائی پر پڑتی تھی تو ان کی وہ باغیانہ روح تڑپ اٹھتی تھی جس کا جوہر انسان دوستی تھا۔ ایسے ہی لمحوں میں وہ فرشتوں کے نام یہ فرمان خدا بھجواتے تھے:

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو | کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو!
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے | کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو!
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ | جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی | اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

یہ ایک حقیقت ہے کہ انقلاب روس کی کامیابی نے ان کے بہت سے تصورات کو تقویت پہنچائی تھی حالانکہ وہ اشتراکیت کو ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ ان کی بعض نظمیں اور بعض اشعار دیکھ کر تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اگر انقلاب روس نے ان کے خیالوں کو مہمیز نہ کیا ہوتا تو اپنی انسان دوستی کے باوجود ان کا لب و لہجہ اور انداز بیان بالکل مختلف ہوتا۔ مشہور نظم ساقی نامہ کے یہ اشعار دیکھیے:

زمانے کے انداز بدلے گئے | نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ | کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے | زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا | تماشا دکھا کر مداری گیا

پیامِ مشرق کی کئی فارسی نظموں میں مزدوروں اور محنت کشوں کو یہ بات یاد دلائی گئی ہے کہ تمہاری محنت کا پھل سرمایہ دار کھاتا ہے اور تم بھوکے مرتے ہو۔ تم مشین ڈھالتے ہو

اور وہ دوسروں کی ہوتی ہے۔ تم کارخانے بناتے ہو اور ان کا مالک کوئی اور ہوتا ہے۔ تم ریشم اور کمخواب تیار کرتے ہو اور وہ کوئی اور پہنتا ہے۔ تمھاری قسمت میں ٹاٹ اور بوریے رہ جاتے ہیں۔ تمھارے بچوں کے آنسو اور تمھارے خون کے قطرے تمھارے آقاؤں کے حسن میں افزائش کرتے ہیں اور تم کسی طرح جیتے جاتے ہو۔ 'قسمت نامہ'، 'سرمایہ دار و مزدور' اور 'نوائے مزدور' ایسی ہی نظمیں ہیں۔ 'قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور' میں مزدور سرمایہ دار سے کہتا ہے:

غوغائے کارخانۂ آہنگری زمن — گلبانگ ارغنون کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج برو می نہد زمن — باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
تلخابہ کہ دردِ سر آرد از آنِ من — صہبائے پاک آدم و حوا از آنِ تو
ایں خاک و آنچہ در شکمِ او از آنِ من — وز خاک تا بہ عرشِ معلّیٰ از آنِ تو

اور نوائے مزدور میں مزدور نعرہ لگاتا ہے:

مغان و دیر مغاں را نظام تازہ دہیم — بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنان چمن انتقام لالہ کشیم — بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم
بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے — ز خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

اس طرح دیکھا جائے تو انقلاب روس اور اشتراکی نظام نے انھیں اپنی تصوریت میں حقیقت کا رنگ بھرنے کا موقع دیا۔ اس لیے وہ مختلف مواقع پر کارل مارکس کو طرح طرح سے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ضرب کلیم میں مارکس کی آواز اس طرح گونجتی ہے:

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش
تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوطِ خمدار کی نمائش مریز و کجدار کی نمائش
جہانِ مغرب کے بتکدوں میں، کلیساؤں میں مدرسوں میں

ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیّار کی نمائش

یہاں مارکس سارے قدیم اقتصادی اور معاشی تصورات پر خطِ نسخ پھیرتا نظر آتا ہے۔ تاکہ ایک بہتر نظامِ زندگی کی طرف متوجہ کر سکے۔ اقبال نے ایک متشکک کے انداز میں بار بار اشتراکیت کے اندر چھپے ہوئے امکانات کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بیداری کا پیام دیا ہے۔ ضربِ کلیم میں ایک جگہ کہتے ہیں:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار

اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

ایک اور نظم بالشویک روس کے عنوان سے ہے اور خاص طرح کی ذہنی کشمکش کے ساتھ لکھی گئی ہے:

روشِ قضائے الٰہی کی ہے عجیب و غریب
خبر نہیں کہ ضمیرِ جہاں میں ہے کیا بات

ہوئے ہیں کسرِ چلیپا کے واسطے مامور
وہی کہ حفظِ چلیپا کو جانتے تھے نجات

یہ وحی دہریتِ روس پہ ہوئی نازل!
کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات و منات

ان واضح خیالات کے علاوہ بعض اور نظموں میں بھی انقلابِ روس اور اشتراکیت کے اثرات کے متعلق چھپے ہوئے اشارے ملتے ہیں۔ اشتراکیت میں جو انقلابی جرأت، غریبوں سے ہمدردی، اقتدار پرستی اور سرمایہ داری کی مخالفت ہے۔ وہ اقبال کو اپنے انسان دوست عقائد سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کا اخلاقی اور روحانی نظام ان کی گرفت میں نہیں آتا۔ تاہم یہ کہنا درست ہوگا کہ انقلابِ روس کا جیسا والہانہ خیر مقدم اقبال نے کیا اور اس کے معاشی پہلوؤں کو جس طرح انھوں نے افکارِ شعری کا جز بنایا۔ کوئی دوسرا شاعر اس انداز میں ان کے قریب بھی نہیں پہنچ سکا۔ دولتِ حاضر کے مسلمان دانشوروں اور مفکروں میں اقبال کا جو مرتبہ ہے اس کی اہمیت ابھی پوری طرح واضح نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ شاعر ہونے کی وجہ سے ان

کا مجموعی اثر کبھی الفاظ اور استعارات کی رنگینی میں کھو جاتا ہے۔ اور کبھی ایسی تعبیرات کا شکار ہو جاتا ہے جو ان کے عالمی نقطۂ نظر سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ پھر بھی جہاں تک ان کی انسان دوستی اور عظمت انسانی پر یقین رکھنے کا تعلق ہے وہ وہی کہتے ہیں جو ایک اچھا اشتراکی مفکر کہتا ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا تسخیر فطرت کا خواب اشتراکی روس کے دانشور ہی پورا کر رہے ہیں۔ 'جاوید نامہ' میں اقبال جس فلک قمر تک اپنے خیالات میں گئے تھے وہاں آج روس کا خلا میں پرواز کرنے والا نوجوان حقیقت میں پہنچ رہا ہے۔ اقبال اپنے ذہنی سفر کی وہی تصویر پیش کرتے ہیں جو خلا باز اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہے